۲۲ مئی ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۱۲

اس شمارے میں

۱۔ اداریہ	۱	۴۔ انجمن کی خبریں	۹
۲۔ نودریافت دیوانِ غالب کی تصدیق کی بنیاد محمد انصار اللہ	۳	۵۔ اخبار و افکار	۱۰
		۶۔ میرا صفحہ	
۳۔ مراسلات	۸	اسلوب احمد انصاری	۱۲

اداریہ

بنگلہ دیش سے آئے ہوئے لوگوں کی امداد کیجیے

۲۶ مارچ سے جو کچھ مشرقی بنگال (بنگلہ دیش) میں ہو رہا ہے اس پر ہر وہ شخص گہرا درد و کرب محسوس کر رہا ہے جسے انسانیت کی قدروں سے کچھ بھی ہمدردی ہے۔ پاکستان کی فوج نے مشرقی بنگال کے باشندوں پر بڑے مظالم کئے ہیں۔ ان کے غصے کی زد سے نہ نہتے شہری بچے ہیں نہ دانشور، نہ استاد نہ طالب علم۔ اخبارات کی اطلاعات کے مطابق لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتر گئے، لاکھوں گھر سے بے گھر ہو گئے، شہر تباہ ہو گئے۔ قصبات خاک سیاہ کر دئے گئے۔ مشرقی بنگال پہلے ہی سائیکلون کے قہر کی وجہ سے نیم جان ہو رہا تھا، اس قیامت نے تو وہاں کی سماجی اور اقتصادی زندگی کو ایسی ضرب لگائی ہے کہ اس کی درستی کے لئے بہت مدت درکار ہوگی۔ وہ لوگ جو کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر اور سرحد پار کرکے ہندوستان میں داخل ہوئے ہیں کسی طرح بیس لاکھ سے کم نہیں ہیں۔ ان مصیبت زدہ اور بے خانماں افراد کے مغربی بنگال، تری پورہ، آسام اور منی پور میں پناہ لینے سے ہندوستان کی اقتصادی حالت پر بھی اثر پڑے گا۔ مصیبت زدہ اشخاص کی امداد ایک انسانی فریضہ ہے اور ہندوستان کی حکومت اپنے انسانی فریضے کو اپنے مقدور بھر ادا کر رہی ہے۔ ہندوستان کے عوام بھی اس سلسلے میں دامے، درمے، سخنے، قدمے امداد کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں، تمام دانشوروں اور قومی اور سماجی اداروں نے مشرقی بنگال سے آئے ہوئے ان افراد کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ہے اور ان کو غذا، کپڑے اور طبی امداد بہم پہنچانے کے لئے چندہ ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان اتنی بڑی تعداد کے مستقل طور پر یہاں رہنے کا انتظام نہیں کر سکتا، اس لئے قدرتی طور پر اس کی خواہش ہے کہ جلد سے جلد مشرقی بنگال میں حالات نارمل ہو جائیں، وہاں کے لوگوں کو اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنے کا موقع ملے اور جتنے اختلافی مسائل ہیں وہ پرامن طریقے سے اور آپس کی گفتگو سے طے ہوں، نہ کہ توپ اور طاقت کے ذریعہ سے۔ مشرقی بنگال کی آبادی پاکستان کی آبادی کی پچپن فیصدی ہے۔ وہاں کے لوگوں نے حال ہی میں انتخابات کے ذریعہ سے اپنی مرضی ظاہر کر دی ہے۔ اس مرضی کا احترام ضروری ہے۔ یوں بھی طاقت کے ذریعہ سے عوام کو کچھ عرصے کے لئے دبایا جا سکتا ہے لیکن زیادہ مدت تک ان کی خواہشات کو پامال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا پاس ضروری ہے اور کرنا ہی پڑے گا۔ ہم لوگ ایک تو انسانیت کے ناتے، ان

مظالم پر بجا طور پر احتجاج کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔ دوسرے وہاں اگر ظلم ہوتا ہے اور وہاں سے لوگ بھاگ کر بڑی تعداد میں ہمارے ملک میں آتے ہیں تو ہمیں نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ضروری ہے کہ ایسے موقع پر سب سے پہلے ان مصیبت زدہ افراد کی فوری مدد کی جائے اور ان کے قیام کے لئے تمام ضروریات مہیا کی جائیں اور پھر دنیا کے ضمیر کو بیدار کیا جائے تاکہ پاکستان کی فوجی حکومت اپنے شہریوں کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک ترک کرکے ان کے مسلمہ لیڈروں سے پھر گفتگو کرے اور ان کی مرضی کے مطابق اپنی آئندہ پالیسی بنائے۔ حیرت کی بات ہے کہ جس پارٹی کے لیڈر کو پاکستان کا ہونے والا وزیر اعظم کہا گیا تھا، اسے کچھ دن بعد غدار قرار دیا گیا اور پورے پاکستان کی قومی اسمبلی میں جس پارٹی کی اکثریت تھی، اسے غیر قانونی قرار دیا گیا۔ عوامی پارٹی کے چھ نکات کا مقصد مشرقی بنگال کے عوام کی خوشحالی اور ترقی تھا، اس کا مقصد پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچانا نہ تھا۔ بعد میں جو کچھ ہوا، وہ فوجی حکومت کی جارحانہ پالیسی کا ردِ عمل ہے۔ دنیا کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کسی علاقے کے عوام کو نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے نہ کوئی نظام حکومت جبریہ ان پر نافذ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے ہمیں یقین ہے کہ بالآخر مشرقی بنگال کے باشندے اپنی مرضی کے مطابق اپنی زندگی بسر کر سکیں گے۔ فی الحال تو ہمیں ان پناہ گزینوں کی مدد کرنی ہے جو لٹے ہوئے اور بے خانماں ہمارے ملک میں آئے ہیں۔ اب تو اوقاف نے بھی ان پناہ گزینوں کی امداد کے لئے اپیل کی ہے۔ اس وقت ہم سب کا فرض یہ ہے کہ جو مرکزی کمیٹی دلی میں بنائی گئی ہے اس کو ان مصیبت زدہ افراد کی مدد کے لئے جو بھی چندہ ہم بھیج سکیں وہ بھیج دیں۔ اس کے ساتھ ہمیں پاکستان کی حکومت سے بھی یہ اپیل کرنی چاہئے کہ وہ جلد سے جلد موجودہ فوجی کارروائی بند کرکے مشرقی بنگال کے مسلّمہ لیڈروں سے بات چیت کرے اور وہاں امن و آشتی کی وہ فضا پیدا کرے جس میں مشرقی بنگال کے لوگ اپنی سیاسی اور سماجی زندگی کی تنظیم اپنی جائز خواہشات اور اپنے فطری میلانات کے مطابق کر سکیں۔

حیف است انسانی چیدن از تپش سالیاں
از سموم تُند و در باغ عدن بریاں شدن

سہ ماہی سوغات

سہ ماہی سوغات زیر ادارت محمود ایاز اپنے دورِ ثانی کا آغاز کر رہا ہے۔ پہلا شمارہ جولائی ۱۹۷۱ء میں شائع ہوگا۔ دو سو سے زائد صفحات پر ڈمی سائز قیمت فی شمارہ ڈھائی روپے۔ خط و کتابت کا پتہ: سہ ماہی سوغات ۱۹۔ کلاسن روڈ بنگلور ۵

• ناہید نگار

اردو صحافی مولانا عبدالرؤف عباسی کا انتقال

لکھنؤ: ۱۲ مئی۔ اردو کے معمر صحافی اور اخبار "حق" کے ایڈیٹر اور مالک مولانا عبدالرؤف عباسی کا ان کی قیام گاہ پر انتقال ہو گیا۔

عباسی صاحب جن کی عمر تقریباً ۷۶ سال تھی سال بھر سے گلے کے کینسر میں مبتلا تھے۔ ان کے پس ماندگان میں بیوہ اور ایک بہن شامل ہیں۔

عباسی صاحب نے ۱۹۲۵ء میں "حق" کی اشاعت ہفت روزہ کی حیثیت سے شروع کی تھی جو بعد میں کچھ دنوں کے لئے روزنامہ ہو گیا اور ۱۹۴۶ء تک پابندی سے نکلتا رہا۔ بعد میں پھر ہفت روزہ ہو گیا اور ۱۹۵۶ء تک شائع ہوتا رہا۔

عباسی صاحب نے ایک اردو ماہنامہ "کائنات" بھی نکالا تھا مگر وہ صرف چند مہینوں تک ہی جاری رہ سکا اس کے علاوہ عورتوں کے لئے ایک رسالہ "ضیاء" کچھ عرصہ تک نکالتے رہے۔ ایک ناول "نواب جلیل الشان" کے مصنف بھی تھے۔

• قومی آواز

کتابیں ملیں

۱۔ چراغِ راہ۔

مصنف: ایم اے نصر
ناشر: انجمن اصلاح المسلمین ۵ دلی اللہ لین کلکتہ ۱۷

۲۔ لامکاں۔

مصنف: غلام مرتضیٰ راہی
ناشر: نصرت پبلشرز وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ
قیمت: تین روپے

محمد انصار اللہ

نو دریافت دیوان غالب کی

تصدیق کی بنیاد

جناب سید مسعود احمد صاحب کا مراسلہ (ہماری زبان ۸ مارچ ۱۹۹۱ء) نظر نواز ہوا۔ اس کا جواب عرض کرنے سے پہلے چند اور حقائق پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

اپنے بزرگوں کی عالی حوصلگی، وسیع النظری اور علم نوازی کی حکایات اور روایات بہت سنی تھیں لیکن حقیقت اس وقت سامنے آئی جب میں نے نو دریافت دیوان غالب سے متعلق اپنے شکوک کا اظہار کیا۔ بظاہر نہایت متین اور بصورت بڑے پاکیزہ بزرگ کی طرف سے جو ردعمل ہوا میرے نزدیک نہایت غیر علمی کھاتی پو دا پنے بچوں کی آنکھیں دکھتی ہے، انھوں نے جب بزرگوں کا یہ انداز دیکھا تو انھیں جو کرنا چاہیے تھا کیا۔ ایک صاحب نے میری تحریر کو 'CHEAP SCANDAL' کہا دوسرے نے لکھا کہ یہ شخص غالب کے ایک شعر کیا ایک مصرعہ کو صحیح پڑھ بھی نہیں سکتا سمجھنا تو خیر دور کی بات ہے۔ مجھے اپنے ان نوجوان دوستوں سے ہرگز کوئی شکایت نہیں البتہ بزرگوار کے رویہ سے رنج ہوا۔ علمی معاملات میں جو جبر میرے لیے جائز خیال کیا جا رہا ہے اس کی بابت کچھ عرض کرنا فضول ہے البتہ میں نے اوّل روز سے اس مسئلہ کو علمی مسئلہ سمجھا تھا اور اب بھی اسی خیال پر قائم ہوں۔

اس نسخۂ دیوان کی تصدیق سب سے پہلے امتیاز علی خاں صاحب عرشی نے کی۔ واقعہ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> "رامپور پہنچ کر جب میں نے عرشی صاحب کو یہ خبر سنائی اور ان کی خدمت میں متعلقہ نوٹ اور عکس پیش کیے تو اس وقت عرشی صاحب پر جو خوشگوار ردعمل ہوا اس کا خاکہ نہیں کھینچا جا سکتا۔۔۔۔ وفور جذبات کا یہ عالم تھا کہ ۔۔۔۔ کہا کہ دیکھو جلال الدین تو جبرئیل بن کر آئے ہیں اور کلام غالب لائے ہیں۔"
>
> (ہماری زبان ۱۵ ر جون ۱۹۶۹ء)

یعنی یہ تصدیق کرتے وقت عرشی صاحب کے پیش نظر اصل مخطوطہ نہ تھا، کچھ صفحات کا (یا ممکن ہے کہ کل کا) عکس ان کے سامنے تھا (عکس میں بعض باتیں اصل کی حد تک واضح نہیں ہوتیں اور اگر کل اوراق کا عکس بھی سامنے نہ تھا تو تمام نکات کا سامنے آجانا بھی ممکن نہ تھا) اس کے علاوہ ان کی خدمت میں کچھ متعلقہ نوٹ "پیش کیے گئے (یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جلال الدین صاحب نے ترقیمہ کی بنیاد پر نسخہ کو بخط غالب سمجھا تھا اور "متعلقہ نوٹ" اسی نظریہ کے موید ہوں گے) ان چیزوں کو دیکھ کر "وفور جذبات" میں عرشی صاحب نے جو بات کہی وہ بجائے خود ان کے جذبات کی آئینہ دار ہے یعنی جذبات کے وفور میں، پورے حقائق پیش نظر نہ ہونے کے باوجود (بلکہ یک طرفہ نوٹ دیکھ کر) ایک سرسری نظر میں نسخہ کے بخط غالب ہونے کی تصدیق کی گئی۔ دوسرا پہلو عرشی صاحب کے پیش نظر تھا ہی نہیں۔ توقع یہ تھی کہ دوسرا رخ سامنے آنے پر اس طرف بھی توجہ کی جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بہر حال عرشی صاحب کی اس "تصدیق" کو غیر معمولی اہمیت دی گئی، میرا خیال یہ ہے کہ عرشی صاحب بشر ہیں (بشر کے سوا اگر کوئی صاحب انھیں کچھ اور سمجھتے ہوں تو میں ان کی تائید کرنے سے بالکل معذور ہوں) اور کوئی بشر ایسا نہیں ہو سکتا جس سے سہو و خطا ممکن نہ ہو۔ عرشی صاحب نے تحقیق میں غلطیاں کی ہیں اور ہر طرح کی غلطیاں کی ہیں اس وقت صرف ایک کا ذکر کرتا ہوں (یہ اس لیے کہ میں عرشی صاحب کے سن و سال اور مطالعہ کے سبب ان کا احترام کرتا ہوں اور یہ احترام اس سے زیادہ کے بیان شمار کرانے سے مانع ہے) موصوف نے دیباچہ "دستور الفصاحت" کے حوالے سے لکھا ہے:

> "دہلی میں میرزا محمد سلیم بہادر بہادر شاہ ثانی کے لقب سے اور لکھنؤ میں ثریا جاہ امجد علی شاہ کے لقب سے بر سر حکومت تھے"
>
> (دستور الفصاحت، دیباچہ ص ۹)

اتنی بات سب جانتے ہیں اور یقینی طور پر عرشی صاحب بھی جانتے ہیں کہ دہلی کے تخت پر بہادر شاہ ثانی کے نام سے جو شخص بادشاہ ہوا اس کا نام "میرزا محمد سلیم بہادر" نہیں تھا۔ ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی کے بھائی کا نام میرزا محمد سلیم تھا عرشی صاحب کو اس موقع پر سہو ہوا بالکل اسی طرح جیسے اس نسخۂ دیوان کی "تصدیق" کے وقت ہوا۔ یہ مخلصین کا فرض تھا کہ وہ ایسے امور کی طرف موصوف کو متوجہ کرتے۔ ایسے موقع پر خاموشی اختیار کرنا میرے نزدیک علمی نقطۂ نظر سے جرم ہے۔ میں نے اسی علمی فریضہ کی ادائگی کی تھی۔ اس کے جواب میں

> دو گالیاں کہ بوسہ خوشی ہے آپ کی

اس نسخے کے بخط غالب ہونے کی تصدیق تین بنیادوں پر مکمل ہے:

۱۔ اس میں کلام غالب کا پایا جانا

۲۔ سواد خط

۳۔ ترقیمہ

جہاں تک پہلی بنیاد کا معاملہ ہے اتنی بات صحیح ہے کہ اس میں بیشتر غالب کی مستند اور معروف غزلیں مندرج ہیں لیکن ساتھ ہی ایسا کلام بھی قابل ذکر حد تک ملتا ہے جس کے کلام غالب ہونے کی تصدیق کسی دوسرے ذریعے سے نہیں ہوتی۔ مقطع میں کسی شاعر کا تخلص نظم ہونا اس بات کا ثبوت لازماً نہیں ہے کہ غزل اسی شاعر کی ہے۔ پھر یہ بات بھی

ہمارے علم میں ہے کہ اسد اور غالب دونوں تخلص کے ایک سے زائد شاعر مختلف زمانوں میں گزرے ہیں۔ اس دیوان میں کم از کم ایک غزل ایسی ہے جو غالب کی زندگی میں میر امانی اسد کے نام سے منسوب ہو کر شائع بھی ہو چکی تھی علاوہ ازیں ہر غزل کے کلام غالب نہ ہونے کی تصدیق قدیم مآخذ کی روشنی میں نہ ہو سکنے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ غالب ہی کی غزل ہے (ہجراں والی غزل کا قضیہ اس سلسلے میں پیش نظر رہنا چاہیے)

میر امانی اسد کی اس غزل کی بابت جو اس نسخۂ دیوان غالب میں مندرج ہے حمیدہ سلطان صاحبہ نے ایک مراسلے میں استاذ محترم قاضی عبدالودود صاحب کے حوالے سے جو عبارت شائع کی ہے وہ یہ ہے:

"گلشن ہمیشہ بہار ایک مجہول الاحوال مولف کی غیر معروف تصنیف ہے۔ اس میں اسد کے دو مخمس[1] اس طرح درج ہیں کہ گویا یہ دو مختلف شاعروں کے ہیں۔ ..... کسی تذکرے میں گلشن ہمیشہ بہار کے سوا غزل مذکور نہیں ملتی ...... یہ غزل جہاں تک مجھے کا تعلق ہے بے شک غالب کی غزل تسلیم کی جا سکتی ہے۔" (ہماری زبان یکم نومبر ۱۹۷۰ء)

مجھے اس اقتباس سے کئی پہلوؤں سے اختلاف ہے۔

(۱) گلشن ہمیشہ بہار کا مولف "مجہول الاحوال" سہی لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دنیا میں کوئی بڑے سے بڑا جھوٹا شخص بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس نے کوئی بات کبھی سچ نہ کہی ہو کسی بھی قول کی جب تک تکذیب یا تردید نہ کر دی جائے اس کی بابت جھوٹ ہونے کا حکم صادر نہیں کیا جا سکتا جو عمل ہرگز مستحسن اور قرین انصاف نہیں ہے۔

(۲) کسی تصنیف کے معروف یا غیر معروف ہونے سے اس کے اندراجات کی تردید لازم نہیں آتی۔ محققین نے اکثر نہایت غیر معروف تصانیف دریافت کر کے پیش کی ہیں، ان کی دریافت ان کا کارنامہ ہے اور ان سے کتنے ہی نئے حقائق سامنے آئے ہیں۔ گلشن ہمیشہ بہار سے بھی ایک نئی حقیقت سامنے آئی ہے اور وہ اہم ہے۔

(۳) کسی غزل کا کسی ایک ہی تذکرے میں مندرج ہونا اور دوسروں میں نہ ہونا اس کی ہرگز دلیل نہیں ہے کہ وہ غزل اس شاعر کی ہے ہی نہیں۔ تاوقتیکہ برخلاف شہادت نہ مل جائے محض اسی ایک تذکرے میں مندرج ہونے کے سبب اس کی تردید نہیں کی جا سکتی۔

(۴) اب دیکھیے کہ سند میں پیش کر کے کسی کے صریح بیان کو جھٹلانا تحقیق میں درست نہیں، ایک شاعر ایک سے زائد شاعروں کے طرز میں شعر کہہ سکتا ہے اور کہتا بھی ہے۔ اس لیے یہ دلیل نہایت کم وزن ہے، عرشی صاحب نے بھی ایک موقع پر لکھا ہے:-

"رنگ کلام کو شہادت میں پیش کرنا بے حد خطرناک ہے اس لیے میں اس کلام کو غالب کے یقینی کلام ...... کا درجہ اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک کوئی مستند شہادت سامنے نہ آ جائے۔" (نسخۂ عرشی)

اس موقع پر آسی مرحوم کی پیش کردہ بیاضوں کی طرف خیال کرنا بھی مناسب ہے جن میں مندرج کلام کے کلام غالب ہونے کی رنگ کلام کی بنیاد پر تصدیق نیاز فتحپوری مرحوم اور جناب مجنوں گورکھپوری جیسے صاحب نظر ناقدین کر چکے تھے، اس تجربے کے بعد پھر اسی شہادت پر اعتماد کرنا نہایت خطرناک ہوگا۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خوشگی غالب کا عقیدت مند بھی تھا چنانچہ غالب کا ذکر ان لفظوں میں کرتا ہے:

"نکتہ سنجی مزاج اوست و موزونیت کلام از جوہر طبع وہاج او، شاعری ست کہ مانندش درین ... زمان معدوم ...... نظیری در تغزل پیش او .... از شعرای عالی ست و عرفی ... خیر نامی ...... گوی سبقت از ہمسراں بردہ ...... این اشعار از آں استاد شریف است" (ص ۲۲۶)

ایسے عقیدت مند کے متعلق بدگمانی مناسب نہیں بالخصوص اس لیے کہ اس نے یہ تذکرہ شیفتہ کے تذکرے کے جواب میں لکھا تھا اگر اس نے غالب کی غزل اسد سے غلط منسوب کی ہوتی تو شیفتہ اور ان کے احباب و تلامذہ اس کی نشاندہی کر کے خوشگی کو خوب مطعون کر سکتے تھے لیکن ایسا نہیں ہوا اس کے باوجود یہ اصرار کہ "بے شک یہ غزل غالب ہی کی ہے" گویا اس بات کا دعویٰ ہے کہ یہ حضرات بزعم خود غالب، شیفتہ اور ان دونوں کے احباب و تلامذہ کے مقابلے میں غالب کے کلام سے زیادہ واقف ہیں۔

"باغ جنت" میں اس غزل پر جو خمسہ مندرج ہے اس پر اسے "غزل اسد" کہا ہے۔ وہ زمانہ تھا جب غالب تخلص سے مرزا مشہور ہو چکے تھے اس زمانے کے تذکرہ نویسوں نے جہاں ضرورت ہوئی ہے اسد کے ساتھ غالب تخلص کا بھی ذکر کیا ہے۔ محض اسد تخلص سے تیرھویں صدی ہجری کے ربع آخر میں مرزا کو بالعموم یاد نہیں کیا گیا (دیکھو تذکرہ نادر، چمن بے نظیر وغیرہ) دونوں تخلص اس لیے

---

[1] گلشن ہمیشہ بہار مطبوعہ ۱۹۶۶ء میں دیکھا ایک مخمس بھی میر امانی کے نام سے مندرج نہیں۔ یقین ہے کہ استاذ محترم قاضی صاحب مدظلہ نے تذکرہ ضرور دیکھا ہوگا

لکھے جاتے تھے کہ ان کے کلام کو اسد تخلص کے دوسرے شاعروں سے الگ کیا جا سکے، "باغ دو در" میں صرف "غزل اسد" لکھا جانا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ غزل اسد اللہ خاں غالب و اسد کی نہیں ہے۔

اس نسخہ دیوان کے بخط غالب ہونے کی تصدیق کی دوسری بنیاد "سواد خط" ہے۔ مرزا سے منسوب تحریریں بکثرت موجود ہیں اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے بعض کی بابت اختلاف ہے۔ مثال کے طور پر پہلے بھوپالی نسخے پر مندرج اصلاحوں کے متعلق مرتب نسخہ حمیدیہ کا خیال تھا کہ وہ سب بخط غالب ہیں اور دلیل یہ دی گئی تھی کہ:

"اس میں اور غالب کے طرز تحریر کے موجودہ نمونوں میں ایک گونہ مشابہت پائی جاتی ہے"

عرشی صاحب نے اس سے اختلاف کیا اور یہ کہا کہ

"بعض مقامات پر وہ بالیقین مرزا صاحب کا نہیں معلوم ہوتا" (نسخہ عرشی)

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے حال ہی میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:

"کچھ عجب نہیں کہ حاشیوں پر شکستہ خط کے بعض اضافے جو تربیت یافتہ خط شکست کے آئینہ دار تھے اور جن پر غالب کے خط کا دھوکا ہو چکا ہے انھیں (کاتب) کی سرسری جنبش قلم کا نتیجہ ہوں"

(نیا دور، اگست ۷۰ء)

یعنی غالب کی تحریر کی شناخت میں ایک کے قول کے مطابق دوسرے کو دھوکا ہوا۔ نو دریافت نسخہ دیوان پر مندرج "لعل خاں والی یادداشت" کے متعلق بھی ایسا ہی معاملہ ہے عرشی صاحب نے اسے بخط غالب مانا ہے اور جناب مالک رام کا خیال ہے کہ:

"یہ غالب کے سواد خط سے مشابہ نہیں اور اس میں بعض ایسی خصوصیتیں ملتی ہیں جو غالب کی روش نہیں" (گل رعنا، مقدمہ ص ۔۔)

مالک رام صاحب نے "بعض ایسی خصوصیتوں" کی تفصیل نہیں لکھی ورنہ شاید زیادہ فائدہ کی صورت ہوتی بہر صورت ان شواہد کی موجودگی میں عرشی صاحب کا بھی غالب کی تحریر کو پہچاننے میں دھوکا کھا جانا ممکن ہے۔ چنانچہ اس شہادت کو بھی قطعی نہیں سمجھا جانا چاہیے۔

ہندوستان میں اس نسخے کا عکس شایع کرنے والے صاحب نے یکم رجون ۱۹۶۹ء کے ہماری زبان میں یہ فرمایا،

"بغیر کسی مبالغے کے میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ غالب کی جتنی کثیر تعداد میں اصل تحریریں میں نے دیکھی اور استعمال کی ہیں وہ شاید ہی کسی دوسرے شخص کی نظر سے گذری ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لیے اگر ۔ ۔ ۔ ۔ میں یہ کہوں ۔ ۔ ۔ تو اس دعوی میں میرا تجربہ شاید ہی مجھے دھوکا دے"

انھوں نے یہی بات ۲۲ راگست ۱۹۶۹ء کے ہماری زبان میں پھر کبھی الفاظ بدل کے:

"جناب قاضی عبدالودود، جناب مالک رام اور پروفیسر آل احمد سرور کے خط کو مجھ سے ہزار تحریروں کے درمیان بھی پہچاننے میں کبھی غلطی نہ ہوگی ۔ ۔ ۔ غالب کے ساتھ بھی میرا یہی معاملہ ہے جس کی طرف میں نے اپنے ایک مراسلے میں اشارہ کیا تھا"

اس دعوی کی تردید کرنا تو خیر کسی ایک فرد نے بھی اس پر شبہ تک کا اظہار نہیں کیا بلکہ بعض حضرات نے نہایت پُر زور الفاظ میں اس کی توثیق بھی کی ہے۔ ایسی صورت میں اس دعویٰ کی حیثیت "مسلمات" کی ہو جاتی ہے۔ ایک مضمون میں انھیں صاحب نے غالب کے انداز تحریر سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"(غالب نے ناظم کو) اصلاح دیتے ہوئے لکھا ہے۔ 'یہاں ایک کی جگہ اک بے یائے تحتانی درست ہے مگر ہر کے ساتھ ہر یک ہو نہ ہر اک' ۔ ایسے موقع پر انھوں نے اس لفظ کی مخصوص شکل اختیار کی تھی یعنی وہ بے کا شوشہ بناتے ہیں مگر اس کے نیچے نقطے نہیں لگاتے یہی صورت زیر بحث (گل رعنا کے) نسخے میں بھی پائی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہو عکس نمبر ۱ شعر نمبر ۲"

(اردوئے معلی دہلی، غالب نمبر حصہ سوم ص ۲۸۲)

اس عکس نمبر ۱ شعر نمبر ۲ کو دیکھا جائے۔ اس میں "ایک" کی "یے" کے نیچے نہایت واضح طور پر نقطے بنے ہوئے ہیں۔ اردو دنیا میں غالب کی تحریروں کے بقول خود سب سے بڑے مسلم الثبوت ماہر کے مشاہدے اور تصدیق کا اگر یہی معیار اور انداز ہے تو پھر اسی ایک مخطوطہ دیوان غالب پر کیا منحصر ہے کسی بھی قلمی نسخے کو بخط غالب کہا جا سکتا ہے اور اس پر اصرار بھی کیا جا سکتا ہے۔ میں نے مرقع غالب مرتبہ پرتھوی چندر صاحب میں مشمولہ عکس نمبر ۴، ۴۶ میں حرف ڈ پر دو نقطے بنے ہوئے کا ذکر کیا تھا۔ ان صاحب کا خیال ہے کہ ڈ پر دو نقطے اردو میں کبھی نہیں بنائے گئے (حالانکہ خود میرے پاس ایسے مخطوطے موجود ہیں جن میں یہ صورت ملتی ہے) اور مذکورہ دونوں مقامات کے نقطے ان کو "ط" نظر آئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔ تیسری لیکن بظاہر سب سے اہم بنیاد اس نسخے کے بخط غالب سمجھے جانے کی وہ ناقص ترقیمہ ہے جس پر مختلف حضرات

؂ گل رعنا کے نسخہ مالک رام پر بھی ایک موقع پر "محررہ اسد اللہ محرّرہ دوم محرم الحرام" لکھا ہوا ہے لیکن اسے بخط غالب نہیں کہا گیا۔ اسی طور پر اس دیوان غالب کے ترقیمہ میں بھی غالب کا نام ہو سکتا ہے۔

نے اپنے اپنے طور پر شک کیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ غالب نے اپنے بعض خطوں پر بھی دن، تاریخیں، ادھوری لکھی ہیں اس سلسلے میں یہ نکتہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ خط پر اگر صرف دن لکھا ہوا ہو کوئی تاریخ درج نہ ہو تو عام طور پر مکتوب الیہ کے لئے خط کے لکھے جانے کی تاریخ کا قیاس کر لینا مشکل نہیں ہوتا، غالب اس نکتہ سے واقف تھے چنانچہ انھوں نے ایک خط پر اتنا لکھا ہے:

"روز ورود نامہ بلکہ وقت ورود نامہ بعد خواندن نوشتہ شد یکشنبہ"

(خطوط غالب مرتبہ مالک رام خط نمبر ۶۰)

خط پر سال تحریر کرنا تو بالکل ضروری نہیں "سال حال" لکھ دینا بھی کافی ہے۔ غالب نے ایک خط پر یہی کیا ہے۔

"صبح دو شنبہ، پنجم جمادی الاول و نوزدہم نومبر سال حال" (ایضاً۔ خط نمبر ۸۴)

لیکن کتاب کے ترقیمہ کا معاملہ اس سے نہایت مختلف ہے وہاں سال کتابت بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔

"اس ترقیمہ کے سلسلے میں یہ بات بھی اہم ہے کہ کاتب نے "سنہ ہجری" لکھا ہے اور اس "سنہ" پر صرف اعداد تحریر نہیں ہیں، وقت، دن، تاریخ اور مہینہ لکھنے کے بعد سنہ ہجری لکھنا اور اس کے بعد سنہ کے اوپر اعداد کا چھوڑ جانا محض بھول ہو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اصل مخطوطہ میں نے نہیں دیکھا ہے اس لئے اگر یہ صحیح ہے کہ "سنہ" کے اوپر لکھے ہوئے اعداد کو بعد میں مٹا نہیں دیا گیا تو کاتب کا یہ فعل نہایت مشکوک ہے۔ جب بنیاد اس قدر مشکوک ہو تو دعویٰ کا مشکوک ہونا بھی ظاہر ہے۔

اس نسخہ دیوان سے متعلق حال ہی میں میرے ایک شفیق کا گرامی نامہ ملتان سے موصول ہوا ہے انھوں نے اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

"یہاں قمر صاحب جیسے بزرگ سے لے کر مجھ جیسے گوشہ نشین کا یہی خیال ہے کہ یہ مخطوطہ بخط غالب ہے۔ یہاں کسی شخص نے اس پر شبہ کا اظہار نہیں کیا البتہ مجھے ایک چیز کھٹکتی ہے وہ یہ کہ صفحہ اول پر لوح کی جو عبارت ہے وہ یقیناً غالب کے قلم سے نہیں ہے یہ الفاظ یہ ہیں:

'یا علی المرتضیٰ علیہ و علی اولادہ الصلوٰۃ و السلام۔
یا حسن ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ یا حسین ۔ ابو المعانی
میرزا عبد القادر بیدل رضی اللہ عنہ'

میں شیعہ نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ تشیع کے مطابق یہ عبارت غلط ہے۔ دوسری بات یہ کہ لوح کی یہ عبارت صلوٰۃ و سلام اور تسمیہ کا جو عام استعمال ہے اس کے بھی خلاف ہے اور مبہم اور بے معنی بھی۔ یا علی المرتضیٰ کے بعد 'علیہ' کا لفظ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ علیہ السلام کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور علی کو علیٰ سمجھ لیا جائے تو اولاد کا لفظ بے جا ہے۔ 'الصلوٰۃ والسلام' کا استعمال بھی اس جگہ جب کہ اس کے سابقے میں اولاد اور لاحقے میں 'یا حسن' ہو بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ مزید براں اس طرح کی مسلسل عبارت میں یا حسن کے بلا فصل 'تسمیہ' اور اس کے ساتھ یا حسین ابو المعانی میرزا عبد القادر بیدل رضی اللہ عنہ لکھنا۔ انشا کی ایسی صورت ہے جو کم از کم غالب جیسے نابغہ روزگار سے ممکن ہی نہیں۔ ہمارے ناقدین یہ کہتے رہے ہیں کہ غالب عربی[1] سے نابلد تھے لیکن فارسی صرف و نحو اور اردو کے الفاظ کا استعمال ان سے بہتر کون جانتا تھا لہٰذا ایسی تحریر کو غالب سے منسوب کرنا غالب کے ساتھ ظلم ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عفی اللہ عنہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ خدا میرے گناہ معاف فرمائے۔ عام طور پر اس کے معنی یہ لئے جاتے ہیں کہ خدا اس کے گناہ معاف فرمائے (اس پر معافی کی جائے) اسی طرح رضی اللہ عنہ کے معنی ہیں خدا اس سے راضی رہے (خدا اس کو بخش دے) یہ تو کلمات دعائیں کوئی خیر خواہ اپنے کسی عزیز، محب یا خود اپنی ہی ذات کے لئے طلب دعا اور اظہار عجز کی خاطر استعمال کر سکتا ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ عفی اللہ عنہ کے الفاظ جو عام استعمال میں ہیں وہ اسی طرح ہیں کہ محرر خود اپنی ذات کے لئے انھیں استعمال کرتا ہے۔ یہ دلیل اگرچہ کہ وزن نہیں رکھتی مگر میں نے جس دن اس تحریر کو دیکھا تھا اسی دن میں کھٹکا تھا کہ دیوان تمام تر بخط غالب ہے اور یقیناً ہے لیکن لوح کی عبارت غالب کے ہاتھ کی نہیں ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ ...... کسی صاحب سے جو شیعہ عقیدہ سے واقف ہوں اور کلی طور پر واقف ہوں یہ معلوم فرمائیں کہ کیا یہ عبارت اگر شیعہ عقاید کی روشنی میں پرکھی جائے تو درست ہے یا نہیں؟"

میرے ایک اور بزرگ نے بھی حال ہی میں اس نسخہ دیوان غالب کے متعلق اپنے تاثرات مجھے ان الفاظ میں لکھ بھیجے ہیں:

---

[1] مگر غالب کہتے ہیں "میں عربی کا عالم نہیں مگر نرا جاہل بھی نہیں۔" (خطوط غالب ص۸۳)

"میرے خیال میں یہ ویسے کے قلم سے لکھا گیا ہے جسے غالب نے شاید کبھی استعمال نہیں کیا۔ بیشتر جگہ اس میں خط شفیعا ہے جو غالب کا طریق تحریر نہیں تھا۔ لفظ ہے' اس میں بیشتر اس طریقے سے لکھا ہے جو غالب کی سامنے آئی ہوئی تحریروں میں کہیں نہیں ملتا۔"

ان دونوں صاحبوں کے تاثرات من وعن میں نے نقل کرنے میں اس توقع پر کہ اہل علم حضرات ان پہلوؤں پر بھی خیال فرمائیں۔ اب تک اس نسخہ دیوان سے متعلق جو بحثیں سامنے آئی ہیں ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ کم از کم درج ذیل کو بخط غیر تسلیم کیا جا چکا ہے۔

۱۔ حاشیہ پر مندرج غزلیں۔
۲۔ حاشیہ کی غزلوں پر اصلاحیں۔
۳۔ مغل خاں والی یادداشت۔

اور درج ذیل کے بخط غالب ہونے پر شک کا اظہار کیا جا چکا ہے۔

۱۔ آغاز دیوان کی عبارت اور ۲۔ ترقیمہ

یعنی یہ نسخہ بقول اکثر من حیث الاکثر بخط غالب نہیں ہے محض بعض اندراجات کے بخط غالب ہونے پر اصرار کیا جا رہا ہے یہ اصرار تاوقتیکہ اس کے لئے کوئی ثبوت نہ پیش کیا جا سکے بے جا ہے اور قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

اس نسخے سے متعلق میں نے جو بحث کی ہے اس سے پہلی مرتبہ یہ باتیں واضح ہو کر سامنے آئی ہیں کہ کسی مخطوطے کی صحت کو پرکھنے کے لئے کن کن گوشوں پر نگاہ کی جانی چاہئے، ہجری تاریخوں کے تعین میں تقویم پر انحصار بڑی غلطی کا سبب ہو سکتا ہے اور ۱۲۳۱ھ سے متعلق کرنے اس نسخے کے بارے میں جتنی حکایتیں سنائی گئی ہیں کم و بیش سب بے سروپا ہیں لیکن میری اس محنت کی داد دی گئی تو یہ کہہ کر کہ۔

"ڈاکٹر انصار اللہ کے عالمانہ اعتراضات کے باوجود اسے غالب کی تحریر قرار دینے کو جی نہیں چاہتا۔"

بات جی چاہنے پر ہی منحصر ہے تو تحقیق کا نام لینا ضروری نہیں تھا اور ظاہر ہے کہ میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ کسی کو مجبور کروں کہ کسی صحیح بات کو صحیح تسلیم کرنے کے لئے اس کا جی چاہنے لگے۔

یہ مسعود احمد صاحب نے لکھا ہے؛

"ڈاکٹر انصار اللہ صاحب نے محترم نثار احمد فاروقی صاحب کا وہ مضمون ملاحظہ نہیں فرمایا جس میں ۱۲۳۳ھ کو سنہ کتابت قرار دیا ہے۔"

یہ واقعہ ہے لیکن کیا میرے لئے ضروری ہے کہ جس سنہ کو اس سنہ کے پیش کرنے والے نے خود مسترد کیا ہو اسے زیر بحث لاؤں؟ میں اسے تضییع اوقات سمجھتا ہوں۔

سید صاحب کا ارشاد ہے کہ

"۱۲۳۳ھ پر نثار احمد فاروقی صاحب کو بجا اصرار ہے"

میرے خیال میں ان کو اصرار بالکل نہیں ہے انھوں نے تو مئی ۱۹۶۹ء ہی میں یہ لکھا تھا؛

"اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ رجب کا چاند ۲۹ ربیع الثانی[1] کو نظر آ گیا تھا تو ۱۴ رجب ۱۲۳۱ھ بدھ کے بجائے منگل کے دن ہی ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا احتمال بہت قوی ہے کہ رجب ۱۲۳۱ھ میں لکھا گیا ہو۔" (تلاش غالب ص ۲۰۳)

سید صاحب نے مزید لکھا ہے؛

"۱۲۳۱ھ میں ایک دن کا فرق تھا اس لئے کوئی بھی صاحب عقل سلیم اور وہ بھی نثار احمد فاروقی صاحب جیسے مقام کا شخص ۱۲۳۱ھ قبول نہیں کر سکتا بالخصوص ایسی صورت میں کہ کسی دوسری تقویم سے ایک دن کا فرق آ رہا ہو۔"

میں کیا عرض کروں نثار صاحب نے اس سنہ کو نہ صرف قبول کیا بلکہ اس کے لئے جواز بھی پیش کیا عرشی صاحب اور جناب مالک رام نے بھی ۱۲۳۱ھ کو اس سبب کے باوجود نہ صرف قبول کیا بلکہ دوسروں کو بھی باور کرایا ان صاحبوں کے متعلق سید صاحب جو فرمائیں ان کا حق ہے۔

سید صاحب نے مزید فرمایا ہے؛

"۱۲۳۱ھ کو تقویت پہنچانے کے لئے عرشی صاحب کا نام لیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فاروقی صاحب نے ۔ ۔ ۔ خلاف دلائل ڈھونڈے اور وہ نہ ملے تب قبول فرمایا"

خود سید صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ ۱۲۳۱ھ میں واضح قباحت موجود تھی اس لئے صحیح یہی ہے کہ نام سے مرعوب ہو کر قبول کیا، دلائل سے صرف نظر کیا اور واقعی المیہ یہی ہے کہ اس "نام پرستی" نے ہی اس نسخے سے متعلق یہ ساری بحث کھڑی کی ہے کاش یہ واقعہ ہوتا کہ اس نسخے سے متعلق کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اسے جانچنے پرکھنے کی کوشش کی گئی ہوتی۔

سید صاحب نے بالکل سچ کہا ہے کہ؛

"عرشی صاحب کی تائید حاصل نہ ہوتی تو فاروقی صاحب ۱۲۳۳ھ پر جمے رہتے۔"

ایک فاروقی صاحب پر کیا منحصر ہے اس تائید نے ساری اردو دنیا کو گمراہ کیا، میں نے جب یہ عرض کیا تو میرے لئے جو کچھ کہا گیا اس

(باقی صفحہ ۹ پر)

[1] یہاں جمادی الثانی چاہئے غالباً سہو کتابت ہے۔

مراسلات

مرحوم صفدر مرزاپوری کا دیوان

مدت ہوئی ایک اجنبی شخص نے خود کو مرحوم صفدر مرزاپوری کا بیٹا بتایا اور ایک بہت قلیل رقم لے کر اپنے والد کا غیر مطبوعہ دیوان ضمانت کے طور پر میرے پاس رکھوا گئے۔ مجھے نہ ان کا نام معلوم ہے نہ پتہ۔ اگر صفدر مرحوم کے کوئی وارث اس دیوان کو لینا چاہیں تو اپنا حق وراثت ثابت کرکے اس کو لے جائیں۔

لکھنؤ۔ • سید مسعود حسن رضوی

استفسار کے جواب میں

(۱)

آج یکم رمئی کے ہماری زبان میں طاہر محسن صاحب کا استفسار نظر سے گزرا۔ جواب میں مندرجہ ذیل چند سطریں ارسال خدمت ہیں:۔

۱۔ بم پھوٹی: "ببا" بہ معنی چشمہ پرتگالی ہے۔ اردو میں پانی کے پائپ یا نل کے لئے مستعمل رہا ہے۔ پنجابی میں اب بھی مستعمل ہے "بم" اسی ببا کی تحریف یا تخفیف ہے اور چشمے ہی کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہے۔ مہذب اللغات میں اسے "پھوٹنا" کے ساتھ محقق بتایا گیا ہے۔

۲۔ "تجال" کے جو معنی طاہر محسن صاحب نے لکھے ہیں وہی فرہنگ آثر میں دئے ہیں اور اسی حوالے سے مہذب اللغات میں نقل کئے گئے ہیں لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے اور اردو میں کب اور کیوں کر آیا۔

۳۔ چلکا سے: پنجابی میں چلکنا اور چلکانا چمکنے اور چمکانے کے معنی میں آج بھی مستعمل ہے۔ ریت کے چمکنے کو بھی کہا جاتا ہے۔ اردو میں درد کی چمک کے لئے مستعمل ہے۔ ہندی میں چلکا (چمکنے والی چیز کی مناسبت سے) چاندی کے روپے کے لئے مستعمل رہا ہے اور اردو میں "داغ دل" یا داغ الم کے لئے جیسا کہ داغ نے استعمال کیا ہے۔

۴۔ بلٹی: انگریزی میں "LET" اور "ET" تصغیر بنانے کے لاحقے ہیں جیسے RINGLET چھوٹی انگوٹھی، CYGNET چھوٹی بطخ وغیرہ۔ اسی طرح BILL سے BILLET چھوٹا بل یا رسید جو ریلوے کے پارسل وغیرہ کے لئے ملتی ہے۔ بلٹی اسی کا مہند ہے۔

۵۔ خلفشار: خل اور فشار کا مرکب معلوم ہوتا ہے۔ فارسی میں خل" کے بہت سے معنی ہیں (فرہنگ آنند راج) ان میں دو، سوراخ اور برآمد یا آمد (برآمدن یا آمدن کا امر) ہیں یعنی فشار میں آنا، تنگ ہونا لیکن اب اس کے معنی بدل گئے ہیں۔

۶۔ کاہلا: میر انیس نے کالے یا سنولائے ہوئے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ہندی میں کالا ہے لیکن پنجابی میں "کاہلا" (لام میں ہائے مخلوط ہے) عاجل کے معنی میں مستعمل ہے۔ عین ممکن ہے کہ پہلے اس تلفظ کے ساتھ کالے کے معنی میں استعمال ہوتا رہا ہو۔ اردو میں مصمتی خوشے نہیں ہیں جن الفاظ میں ہیں وہ ہندی میں جیسے پریت وغیرہ۔ اردو میں "لھ" کی آواز "کولھا" وغیرہ میں سننے میں آجاتی ہے لیکن "ھلا" کوئی آواز نہیں ہے۔ اردو میں ان خوشوں کو توڑ کر ان کے درمیان ایک مصوتے کا اضافہ کرکے دو مستقل اصوات بنا لینے کا رجحان عام ہے۔ عین ممکن ہے کاہلا" پر بھی یہی عمل ہوا ہو اور یہ "کاہلا" ہوگیا ہو۔

جموں۔ • عابد پشاوری

(۲)

ایما از جناب طاہر محسن صاحب لکھنوی۔ ہماری زبان یکم مئی ۱۹۶۱ء

بم پھوٹنا۔ کنواں گلانے والوں کی اصطلاح ہے۔ کنواں گلاتے وقت شاذ و نادر تہ میں کوئی بہت بڑا سوت آجاتا ہے جس سے پانی اس کثرت سے ابلتا ہے کہ کنواں اوپر تک بھر جاتا ہے ایسی حالت کو بم پھوٹ پڑنا کہتے ہیں معنی ہوئے کسی چیز کی بے تحاشا فراوانی۔

امیر مینائی کے مورد شعر میں استعمال صحیح ہے اور ریاض کے یہاں مشکوک۔

بلٹی۔ انگریزی لفظ BILLET بلٹ سے ماخوذ ہے اس کا قدیم فرانسیسی املا BILLETTE ہے بمعنی کوئی مختصر سا حکم، پروانہ، نوٹ

کاہلا۔ سنسکرت لفظ کاہل بہ ہائے ہوز مفتوح بمعنی پژمردہ۔ سوکھا۔ مرجھایا ہوا سے مشتق ہے۔

بجنور۔ • پرکاش مونس

انجمن کی خبریں

گذشتہ دو دہوں کے شعری ادب کا جائزہ

دہلی۔ انجمن ترقی اردو دہلی کی ادبی نشست منعقد ہوئی جس میں سنہ ۶۹ء اور سنہ ۱۹۵۱ء کے شعری ادب کا جائزہ لیا گیا۔

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی نے اپنا مقالہ پڑھا اس میں انھوں نے غزل کے جدید دور پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ دو سال نہیں میں دس سال کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ غزل نے فنی طور پر کوئی ترقی نہیں کی میں قافیہ ردیف کی کھتونی کو غزل نہیں کہتا، جدیدیت کی رو اب ایسی چلی ہے کہ چند نوجوان اردو شعرا نے غزل کے تقدس کو تباہ کر دیا ہے، رمز و ایما غزل کی جان ہیں لیکن اس دور کے نوجوان غزل گو شعرا نے اس کو معمے کی صورت بنا دیا ہے، چند ایک کو چھوڑ کر اکثر نوجوان شعرا کے یہاں نہ تفکر ہوتا ہے نہ شعریت اگر یہی رنگ رہا تو صنف غزل کا خدا حافظ ہے، ہمیں اس دور کے پڑھے لکھے شعرا سے یہ توقعات ہیں کہ وہ پرانے اساتذہ کے رنگ کو اختیار نہ کریں لیکن حسن تغزل کو بھی برباد نہ کریں، بعض جدید شعرا تو جدت کے زعم میں قافیے اور وزن سے بھی بے نیاز ہو گئے ہیں۔

حسن نعیم صاحب نے اپنی تقریر میں موجودہ دور کے چند نمائندہ شعراء کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ظہیر احمد صدیقی صاحب نے جدید غزل کا صرف کمزور پہلو پیش کیا ہے، میرے کچھ ساتھی بہت اچھی غزلیں لکھ رہے ہیں جو ہر طرح اس قابل ہیں کہ ان کو معیاری کہا جا سکتا ہے یہ بات ضرور ہے کہ تجربہ کرنے کے شوق میں کچھ نوجوان ذرا بہک جاتے ہیں لیکن یہ اس دور ہی نہیں ہمارے متقدمین تک کے کلام میں اکثر فضولیات آجاتی ہیں، کوئی بڑے سے بڑا شاعر ایسا نہیں ہے جس نے اچھے کلام کے ساتھ کچھ فضول نہ کہا ہو۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ غزل جو صنف سخن کی سب سے اہم اور نازک صنف ہے اس میں جدت کے ساتھ روایت کا بھی خیال رکھنا چاہیے۔

ڈاکٹر تنویر علوی صاحب نے اور کوثر چاند پوری صاحب نے مقالے اور تقریر پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ راجندر ناتھ شیدا صاحب نے کہا، حالی کے زمانے سے مفاہیم کے اعتبار سے شاعری نے ترقی کی بہت منزلیں طے کر لی ہیں۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ غزل میں بھی نئے خیالات آئے اور اس نے نئی توانائی پائی دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں اردو شعرا بہت اچھی غزلیں کہہ رہے تھے، مجاز، روش، ساحر، جذبی، فراق اور ان کے علاوہ اور بہت سے ابھرتے ہوئے شعرا تھے جنھوں نے اردو ادب کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا۔ اب ذرا ترقی کی رفتار دھیمی ہے اس کو تیز ہونا چاہیے بہر حال ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے نوجوان شعراء آج کے مسائل کو اپنی غزل میں پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، امید ہے تجرباتی دور سے آگے نکل کر وہ معیاری غزلیں کہہ سکیں گے۔ جناب عبدالخالق نقوی صاحب نے اس نشست کی صدارت کی۔ ● جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو دہلی

باقی صفحہ ۷ سے آگے

ناظرین واقف ہیں۔ بہر حال میری درخواست ہے کہ کم از کم اب تو مسئلہ پر آزادانہ غور کر لیا جائے۔

سید صاحب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں سنہ ۱۲۳۳ھ کے متعلق اپنی رائے ظاہر کروں، عرض کرتا ہوں:

(۱) سنہ ۱۲۳۳ھ کو خود نثار صاحب نے مسترد کر دیا اور اس مقام کا شخص بے دلیل اس سنہ کو مسترد نہیں کر سکتا تھا اس لئے میں اس کی تائید نہیں کر سکتا۔

(۲) سنہ ۳۲ اور سنہ ۳۶ھ کے مسترد کیے جانے کے بعد سنہ ۳۳ پر غور کرنا پھر سنہ ۳۲، سنہ ۳۴ اور سنہ ۳۵ کی صحت کو یکے بعد دیگرے پرکھنا۔ اس طرح پہیلی ضرور بوجھی جاتی ہے تحقیق نہیں ہوتی تحقیق میں ہر پہلو پر نگاہ رکھنی ضروری ہے۔

(۳) عرض کر چکا ہوں کہ اگر یہ فرض کریں کہ غالب نے پندرہ سال کی عمر میں شاعری شروع کی ہو حالانکہ پہلے کے لئے بھی شواہد موجود ہیں تو نسخہ بھوپال اول کا بنیادی مسودہ سنہ ۱۲۳۳ھ سے پہلے کسی زمانے میں تیار ہوا ہوگا۔ زیر نظر نسخہ اگر اس سے قدیم تر سمجھا جائے تو اس کی کتابت اس سے پہلے کسی سال میں ہو چکی ہونی چاہیے تھی سنہ ۱۲۳۳ھ کے لئے کوئی امکان نہیں ہے۔

سید صاحب نے اپنے مراسلے میں ایک اقتباس نقل کیا ہے:

"۱۴ / رجب کو سہ شنبہ کا دن سنہ ۱۲۳۳ھ میں پڑا جو مئی سنہ ۱۸۱۸ء کے برابر ہے اس تاریخ کو منگل کا دن ۱۸۲۱ء میں بھی تھا لیکن ایسے اس وجہ سے ہم نے تسلیم نہیں کیا کہ اس سے پہلے ۱۸۲۰ء میں نسخہ حمیدیہ وجود میں آچکا تھا۔"

میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہ کس طرح معلوم ہوا کہ نسخہ حمیدیہ سنہ ۱۸۲۰ء میں وجود میں آچکا تھا؟ اور (۲) اس دلیل سے سنہ ۱۸۱۸ء کی تردید کس طرح ہوئی؟

امید ہے کہ ان دونوں امور کی وضاحت متعلق حضرات فرما کر میری معلومات میں اضافہ کریں گے، میں اس کے لئے احسان مند ہوں گا۔

اخبار و افکار

اردو کو یوپی کی دوسری سرکاری زبان قرار دینے کا مطالبہ

لکھنؤ، ۱۳ مئی، مسلم مجلس کے صدر ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی نے وزیر اعلیٰ شری کملا پتی ترپاٹھی کے نام ایک خط میں مطالبہ کیا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے اور سیکنڈ فارم کے طور پر آٹھویں درجہ تک یہ زبان سب کو لازمی طور پر پڑھائی جائے دوسرے مطالبات یہ ہیں، رامپور میں ایک اردو یونیورسٹی کا قیام لسانی اقلیتوں کے بچوں کو مادری زبان میں تعلیم کا انتظام۔ • الجمعیۃ

اردو کو دوسری زبان بنانا یوپی کا فرض

لکھنؤ، اردو اسی ملک کی زبان ہے اور حکومت اتر پردیش کا فرض ہے کہ وہ اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دے۔ اگر فی الحال اردو کو دوسری زبان کا درجہ دینے میں کوئی دقت ہو تو حکومت کا کم سے کم اتنا تو فرض ہے کہ سہ لسانی فارمولا کے مطابق یہ اعلان کر دے کہ جو طلبہ اردو زبان پڑھنا چاہیں انھیں اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا حق ہو۔ شہر کانگریس کمیٹی کے ایک جلسہ میں مرکزی وزیر برائے صنعت و اندرونی تجارت شری معین الحق چودھری نے ان خیالات کا اظہار کیا۔

قومی آواز

اردو میڈیم اسکولوں کی مانگ

احمد آباد میونسپل کارپوریشن کی تعاون کمیٹی کے چیئرمین شری جیو تندر بجنشی نے میئر شری نروتم بھائی چودھری کو لکھا ہے کہ شہر احمد آباد میں تقریباً ساڑھے تین لاکھ مسلمانوں کی آبادی ہے یہاں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اس لئے گیارہویں درجہ تک کے اردو میڈیم والے اسکول قائم کئے جائیں اس کام کو آرگنائزیشن کانگریس پارٹی اور میونسپل بورڈ جلد سے جلد عملی طور پر انجام دیں۔ • الجمعیۃ

تجدید ادب بھوپال کا طرحی مشاعرہ

بھوپال: ادارہ تجدید ادب بھوپال کا پچپن واں ماہانہ طرحی مشاعرہ حاجی محمد موسیٰ کی رہائش گاہ اندرون باب عالی قاضی زین العابدین موتیا پارک، حاجی عیسیٰ بھائی کی صدارت میں منعقد ہوا۔

اس کے بعد متعدد مشہور و نامور شعرائے کرام نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ فرمایا۔ صاحب صدر کے اعلان کے مطابق بمبئی سے آئے ہوئے ایک مہمان شاعر سید محبوب علی رزمی نے غیر طرحی غزلیں سنائیں۔

• معتمد خصوصی محمد موسیٰ

بزم اردو پورنیہ کالج کا سالانہ جلسہ

بزم اردو پورنیہ کالج پورنیہ کا تیسواں سالانہ جلسہ و مشاعرہ جناب عبد المنان اسمٰعیل صاحب ایڈوکیٹ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پورنیہ کالج بزم کے صدر جناب پروفیسر میر فضل امام صاحب نے مشاعرے کا افتتاح اپنے صوفیانہ کلام سے کیا۔ اور بیرونی مقامی شعراء نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

محمد خلیق الزماں معتمد بزم نے اپنی سالانہ رپورٹ پیش کی اور پورنیہ کالج میں اردو اور فارسی آنرس کی باضابطہ تعلیم کی مانگ کی۔ مشاعرے کے بعد صدر جلسہ کے ہاتھوں انعامات و اسناد طلبہ کو تقسیم کئے گئے۔

آخر میں پرنسپل جناب ڈینیو دھر جی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور کالج میں اردو آنرس کے کلاس بہت جلد کھلوانے کا وعدہ کیا۔ • محمد خلیق الزماں

ادبی سنگم کا مشاعرہ

ادبی سنگم کا سالانہ مشاعرہ مورخہ ۹ مئی ۱۹۷۲ء کو جناب احسن رضوی کی صدارت میں پٹیا پارک۔ ملاڈ۔ بمبئی میں منعقد ہوا۔

یہ عظیم الشان مشاعرہ جس میں اردو کے جلیل القدر شعراء کے علاوہ ہندی، گجراتی اور پنجابی کے کئی نامور فنکار بھی موجود تھے اس لحاظ سے یقیناً ایک تاریخی حیثیت کا حامل تھا کہ اس سے پہلے مضافات بمبئی میں کبھی اتنا بڑا مشاعرہ منعقد نہیں ہوا۔ اس مشاعرے میں بہت سے ممتاز اور نامور شعرائے کرام نے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔

قیصر عثمانی سکریٹری

(صفحہ ۱۲ سے آگے)

حیثیت سے سطح کے نیچے بین طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

ایلیٹ کی ایک اور مشہور نظم ASH WEDNESDAY میں بھی عیسائیت کا عنصر قابل توجہ ہے۔ نظم چھ حصوں پر مشتمل ہے دوسرے حصے میں خاص طور پر جو موضوعات اہم ہیں وہ ہیں کلیسا کی نیابتی (VICARIOUS) زندگی کی اہمیت، مرحمت GRACE کی تجدیدی قوت اور برگزیدہ اہل مذہب کی جماعت کا قانون۔ اس نظم میں تزکیۂ نفس کی خاطر صعوبتوں کا جھیلنا اور نجات اخروی کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا مرکزی موضوعات ہیں۔ بنیادی اشارے جیسے پہاڑ، صحرا، باغ، سیڑھیاں، اور نقاب، مختلف ماخذ سے لئے گئے ہیں۔ صرف نقاب کا رمز بہت اہم ہے کیونکہ یہ روحانی قلب ماہیت کی طرف اشارہ کرتا ہے پوری نظم میں ارتکاب گناہ کا احساس شدید طور پر پایا جاتا ہے، یہاں رنگ بھی بہت اہمیت رکھتے ہیں، مثلاً نیلے کا رنگ روحانی صعوبت (PENANCE) کی نمائندگی کرتا ہے جس طرح دانتے اور لینگ لینڈ کے یہاں مرحمت اور نجات کے طلبگار کے لئے تین منزلوں سے گزرنا ضروری ہے یعنی گناہ کا اعتراف، ندامت کا احساس۔ بالآخر رضائے خداوندی کے حصول کے لئے حضرت عیسیٰ مسیح کی قربانی کا سہارا، اسی طرح یہ تینوں منزلیں ایلیٹ کی نظم میں بھی پائی جاتی ہیں۔ دراصل حضرت عیسیٰ کی شخصیت کے ارد گرد ہی نظم کا بنیادی ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے۔ اس نظم کو مذہبی عقیدے اور قانون سے اتنا تعلق نہیں ہے جتنا اس جذبے سے ہے جو اس عقیدے اور قانون کو شعور کی گرفت میں لانے سے منسلک اور مربوط ہے۔

شاعری اور تنقید کے علاوہ ایلیٹ کی شہرت کا دارومدار بڑی حد تک ان کے ڈراموں پر ہے۔ شعری ڈرامہ کو حیات نو سے آشنا کرنے والوں میں ایلیٹ کا نام بہت ممتاز ہے۔ انہوں نے شعری ڈرامہ کی زبان کو بول چال کی زبان سے قریب لانے کی کوشش کی اور عام گفتگو کے اتار چڑھاؤ کو شعری متنوع توانائیوں کے اظہار کے لئے برتنے کا جتن کیا۔ اسی لئے ان کے ڈراموں کی زبان شعوری طور پر شاعرانہ ہونے کے باوصف شعری امکانات اور ارتعاشات سے مملو ہے۔ ایلیٹ نے یوں تو تقریباً نصف درجن ڈرامے لکھے لیکن جو مقبولیت ان کے ڈرامے MURDER IN THE CATHEDRAL کے حصے میں آئی، وہ دوسرے ڈراموں کو نصیب نہ ہو سکی اس کی تہ میں اخلاقی جستجو کا احساس پایا جاتا ہے اور اس کا مرکزی موضوع گناہ اور نجات کا تصور ہے۔ ہبوط اور تجدید حیات کا عیسوی ڈرامہ ایلیٹ کے اس ادبی کارنامہ میں متشکل کیا گیا ہے کفارہ (ATONEMENT) کے مذہبی تصور کے لئے سینٹ بکیٹ کی شخصیت محض ایک اشارہ ہے۔ سینٹ بکیٹ کی شہادت کے واقعہ کے ذیل میں اور اس سے منسلک اور بہت سے مسائل بھی زیر بحث آ گئے ہیں۔ لیکن شہادت کی جو تعریف برابر اس ڈرامے میں دہرائی گئی ہے اور جس پر اس کی اساس تمام تر قائم ہے، وہ ہے رضائے خداوندی کی تلاش اور انسانی انا یا قوت ارادی کو رضائے الٰہی میں مدغم کر دینا۔ گویا صحیح معنوں میں شہید وہ ہے جو بہ قول اقبال سیف ید اللہی بن جائے۔ وہ اور اہم موضوعات جو اس ڈرامے کے تار و پود میں شامل ہیں، وہ ہیں وقت اور ابدیت کا آپس میں تعلق اور عمل (ACTION) اور صعوبت (SUFEERING) کا ایک دوسرے سے منسلک ہونا۔ اس ڈرامے میں خاص طور پر ایلیٹ نے خدا کی برتر قوت کے سامنے انسانی عزم و ارادے کی کم تر اہمیت کو برابر نمایاں کیا ہے۔ یہاں بھی انسان کی بے بسی اور علیحدگی کا احساس رہ رہ کر سامنے آتا ہے۔ اس ڈرامے کی پوری فضا اس کے بنیادی تصورات اور اس کی پیکر تراشی سب پر عیسائیت کی مہر لگی ہوئی ہے۔ ایلیٹ نے اس ڈرامے کا رشتہ ازمنہ وسطیٰ کے مذہبی ڈراموں سے جوڑا ہے۔ ایلیٹ کے یہاں عیسائیت کا عنصر ناقابل انکار ہے لیکن اس کے باوجود اس کی شاعری کی عظمت، گہرائی اور گیرائی پر ایمان نہ لانا کفر کے مترادف ہے۔ اس نے انسانی تقدیر کی گتھیوں اور عصری مسائل کو عیسائیت کی بنیادی اقدار کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی ہے، اور اس کوشش پر اس کے منفرد طرز احساس کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

اسلوب احمد انصاری

میرا صفحہ

جدید انگریزی شاعری کے معماروں میں دو نام جو نمایاں طور پر سرفہرست ہیں، وہ ڈبلیو بی ییٹس اور ٹی ایس ایلیٹ ہیں۔ دونوں نے انگریزی شاعری کو ایک نیا آہنگ اور شعور عطا کیا۔ گو دونوں نے جن ذہنی اور روحانی سرچشموں سے اکتساب فیض کیا ۰۰۰ مراحل مختلف ہیں۔ ایلیٹ نے انیسویں صدی کے دور آخر کی شاعری کے خلاف بغاوت کی، فنی اظہار کے نئے اسالیب تراشے، علم الانسان (ANTHROPOLOGY) کے انکشافات سے استفادہ کیا، پرانے حقائق کی نئی تعبیریں پیش کیں اور شاعری کو واقعات کے اظہار سے زیادہ پر اسرار تحت الشعوری تموجات کو زبان عطا کرنے کے لئے استعمال کیا۔ فنی نقطۂ نظر سے انھوں نے تسلسل سے زیادہ عدم تسلسل اور نحوی اور منطقی بیان کے بجائے شعری پیکروں کے دروبست پر زور دیا۔ ایلیٹ کی نظر مختلف علوم اور مختلف زبانوں کے ادب پر گہری تھی اور ان کے ذہن اور ان کی نظر کی پرواز کسی ایک دنیا کی پابند نہ تھی۔ اظہار بیان کے تجربات کے سلسلے میں گر وہ ایک طرف فرانسیسی اشاراتی شاعری اور سترھویں صدی کی انگریزی مابعد الطبیعیاتی شاعری سے متاثر تھے اور فکری اعتبار سے اگر انھوں نے اس اساطیری اشاراتی مواد سے کام لیا، جو انھیں فریزر اور مس ویسٹن کی کتابوں میں دستیاب ہوا تو ایک وسیع اور عالمی نقطۂ نظر کو اپنانے میں وہ بڑی حد تک ایزرا پاؤنڈ کے مرہون منت ہوئے لیکن مجھے اپنی اس رائے کے اظہار میں مطلق تامل نہیں کہ ایلیٹ نے اپنی شاعری کے لئے زیادہ سے زیادہ روحانی غذا جن دو سرچشموں سے حاصل کی وہ ہیں دانتے اور انجیل مقدس۔ ایلیٹ نے اس امر کا برملا اظہار بھی کیا اور اسی پر فخر بھی کیا کہ وہ اینگلو کیتھولک عیسائیت کے پیرو ہیں۔ ان کے چند منتخب کارناموں کا سرسری جائزہ لینے سے اس امر کے تعین میں دشواری نہیں ہو سکتی کہ ان کا شعری مزاج اور تفکر کس نوعیت کا ہے۔

ایلیٹ کا سب سے اہم کارنامہ WASTELAND ہے جس کا موضوع وسیع طور پر زندگی میں موت DEATHINLIFE کا احساس ہے۔ یہ نظم ۱۹۲۲ء میں اشاعت پذیر ہوئی اور اس کے شائع ہوتے ہی گویا ایوان شاعری میں ایک بھونچال سا آگیا۔ اس نظم کے بارے میں ایک غلط فہمی عام طور پر یہ رہی ہے کہ یہ محض اس ذہنی اور جذباتی انتشار اور اضمحلال کی عکاسی کرتی ہے جو پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر یورپ میں محسوس کی جا رہی تھی۔ ازمنۂ وسطیٰ کے عظیم شاعر لینگ لینڈ کی شہرۂ آفاق نظم کے بارے میں بھی اس غلط رائے کا اکثر اظہار کیا گیا ہے کہ وہ ہم عصری سیاسی، معاشرتی اور معاشی بدامنی ابتری اور افراتفری کا مرقع ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ بات لینگ لینڈ کی نظم کے بارے میں ایک محدود نقطۂ نظر کو پیش کرتی ہے۔ درحقیقت نظم کا قلب انسانی روح میں ابدیت اور نجات کی تلاش کا جذبہ ہے۔ مجھے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے کہ ایلیٹ کی نظم ناامیدی اور یاس کی لے پر ختم ہوتی ہے۔ بے شک اس نظم میں احتساب نفس کا عنصر بھی ہے اور تنہائی کے اس شدید کرب کا بھی جو موجودہ دور کے انسان کی روح اور خمیر میں پیوست ہو چکا ہے۔ اس کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں اور ان اسباب کے صحیح اور جائز ہونے میں شبہ نہیں، وہاں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ اس کا تعلق اس گہری روحانی حقیقت یا جذبہ سے منقطع ہو گیا ہے جسے ہم مذہب کے نام سے پکارتے ہیں۔ انسان اپنے جسم کے متعلقات کے اعتبار سے زندہ ہے لیکن اس کی روح جس شدید بحران سے دوچار ہے وہ موت کے مرادف ہے اور جسم کی اس زندگی میں بھی وہ توانائی اور فور کی وہ کیفیت وہ تازگی اور آمد موجود نہیں ہے جو آغاز کار میں تھی۔ ایلیٹ کو یہ پوری کائنات ایک خرابہ نظر آتی ہے، جس میں بقا، نمو اور حیات نو کے آثار ناپید ہیں۔ ان خیالات کے اظہار کے لئے ایلیٹ نے علم الانسان کے اسطور سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس طرح نظم کے مرکزی تصور کو ایک کشادگی، ایک آفاقیت اور ایک ہمہ گیری عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ موجودہ تہذیب کے خلفشار کو اس نے تاریخی سیاق و سباق کے بالمقابل دیکھا ہے اور ایسا کرنے کے لئے متوازیات (PARALLELISMS) اور تقابلات (CONTRASTS) کی فنی تدبیریں استعمال کی ہیں۔ لیکن پوری نظم کو غور سے پڑھ چکنے کے بعد یہ نتیجہ نکالنا شاید غلط نہ ہوگا اس کی بنیاد میں رستخیز (RESURRECTION) کا مذہبی تصور موجود ہے، جو براہ راست عیسائیت کی دین ہے۔ بیشک نظم کی پیکر تراشی علم الانسان کے انکشافات سے مستعار ہے لیکن انجیل مقدس کی بعض کتابوں مثلاً (EZEKIEL)، (ECCLESIASTES) اور ISAIAH سے مستعار کنایے، تمثیلات اور تلمیحات جس طرح نظم کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہیں، ان سے انکار کرنا ممکن نہیں۔ جس مذہبی تصور کا ابھی ذکر کیا گیا وہ ایک زیر زمین موضوع کی

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپوایا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

REGD. NO. L-922 فون نمبر ۲۹ R. NO. 2186/57